ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

رُومی کی چند تشبیہات

(۵)

عالمِ صغیر و عالمِ کبیر

فلسفے کے مباحث میں سے ایک دلچسپ بحث یہ ہے کہ عالم کبیر کے مقابلے میں انسان عالمِ صغیر ہے یا اس کے برعکس انسان عالمِ کبیر ہے اور آفاق کا عالم اس کے مقابلے میں صغیر ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ عکماء کے مذاہب اس میں مختلف ہیں لیکن جن حکماء کو وہ حکمائے الٰہی کہتے ہیں مولانا ان کے ساتھ متفق ہیں کہ انسانِ عالمِ کبیر ہے اور خارجی عالم اس کے مقابلے میں عالمِ صغیر ہے:

پس بصورت عالمِ اصغر توئی   پس بمعنی عالمِ اکبر توئی
در جہانی و از جہاں بیشی   ہمچو معنی کہ در بیاں باشد   (انوری)

انسان کو اگر مقصودِ کائنات قرار دیا جائے تو کائنات سے اس کا تعلق ایسا ہوگا جیسا کہ ثمر کا تعلق شجر سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ظاہر میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ شاخ میں سے ثمر پیدا ہوا ہے لیکن درخت کی حقیقت پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ بیج سے لے کر برگ و شاخ تک سب کچھ ثمر آفرینی کی تمنا نے پیدا کیا ہے لہٰذا ثمر تمام شجر سے مقدم ہے۔ اس کائنات کی تمام ساخت اور اس کے اندر موجودات کا ارتقا سب آخر میں انسان پیدا کرنے کی خاطر تھا۔ نحن الآخرون السابقون کے یہی معنی ہیں:

ظاہرِ آں شاخ اصلِ میوہ است   باطناً بہرِ ثمر شد شاخ ہست
گر نبودے میل و اُمیدِ ثمر   کے نشاندے باغباں بیخ شجر
پس بمعنی آں شجر از میوہ زاد   گر بصورت از شجر بودش نہاد
بہرِ ایں فرمودہ است آں ذوفنون   رمزِ نحن الآخرون السابقون

اوّلِ فکر آخر آمد در عمل
خاصہ فکرے کاں بود وصفِ ازل

مولانا کے نزدیک انسان کا مقصدِ حیات سعیٔ معراج ہے۔ جماد سے لے کر انسان بننے تک انسان مسلسل معراج رہا ہے۔ خدا کی طرف عروج و ارتقا زندگی کی غایت ہے۔ اوپر کی ہستی کے مقابلے میں پست تر ہستی نیستی معلوم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے انسان مسلسل نیستی سے ہستی کی طرف بڑھتا چلا گیا ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ میں معراجی ہوں۔ لیکن عوام نے معراج کو یوں سمجھ رکھا ہے کہ گویا براق پر سوار ہو کر زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرنا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ معراج کی اصل جذبۂ ارتقائے ذات و صفات ہے۔ ایک سرکنڈے میں جب شکر پیدا ہو جاتی ہے اور وہ نیشکر بن جاتا ہے تو یہ اس کی معراج ہے۔ آسمان کی طرف پرواز کرنا اگر معراج کہلائے تو زمین سے آسمان کی طرف جو ہر دم بخارات اٹھتا رہتا ہے کیا اس کو معراج کہہ سکیں گے۔ معراج یہ ہے کہ بچہ رحمِ مادر سے ترقی کرتا ہوا باشعور انسان بن جاتا ہے۔ انسان کی مزید معراج کی منزلیں بھی مکانی یا آسمانی نہیں بلکہ ارتقائی ہیں:

در صفِ معراجیاں گر بیستی — چوں براقت برنتابد نیستی
نے چو معراجِ زمینی تا قمر — بلکہ چوں معراجِ کلکے تا شکر
نے چو معراجِ بخارے تا سما
بل چو معراجِ جنینے تا نہا

مولانا تعجب کرتے ہیں کہ معراج کے معنی ارتقاء و عروجِ نفس اور تکمیلِ صفات و رفعِ درجات، محسوسات میں گرفتار اور زمان و مکان سے آلودہ عقل کی سمجھ میں نہیں آتے۔ براق کو ایک پروں والا گھوڑا سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ براق نیستی سے ہستی کی طرف پرواز کے لئے ایک تمثیل ہے۔ ارتقائے صفات میں انسان ان افلاک ہی کو نہیں بلکہ تمام جہانِ محسوسات کو عبور کر جاتا ہے۔ یہ سفر دست و پا کے ذریعے سے نہیں ہوتا۔ اس سفر کی کیفیت ایسی ہے جیسا کہ عدم سے وجود میں آنا:

خوش براقے گشت خنگ نیستی — سوئے ہستی آردت گر نیستی
کوہ و دریا ہا سمش مس می کند — تا جہاں حس را پس می کند
دست نے و پائے نے او تا قدم
آنچنانکہ تاخت جاں ہا از عدم

میں نے اس صاف گوئی سے پردۂ قیاس کو ہٹا کر اسرارِ معراج کو فاش کر دیا ہے۔ اگر سننے والے کی عقل پر اونگھ غالب نہیں آگئی تو وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں نے کیا کہا ہے:

بر دریدی در سخن پردہ قیاس — گر نبودے سمع سامع را نعاس

عشق نے بالا نہ پستی رفتن است   عشق حق از جنس ہستی رستن است

نجوم و آفتاب پرست

ستارہ پرستوں اور آفتاب پرستوں پر حیرت ہوتی ہے کہ ستاروں کی پرستش اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی تاثیر سے مٹی سونا بن جاتی ہے۔ اسی طرح سورج کو زمین پر اس کے فیضان کی وجہ سے پوجتے ہیں۔ ان کم بختوں سے ایک قدم آگے کی طرف نہیں اٹھتا کہ اس کی پرستش کریں جس نے ایسی تاثیرات کے ستارے بنائے ہیں اور سورج کو حیات بخشی کی توفیق دی ہے۔ سورج تو پھلوں اور ترکاریوں کو پکانے کے لئے ہمارا باورچی ہے۔ یہ لوگ بادشاہ کے سامنے سجدہ نہیں کرتے لیکن اس کے باورچی کو پوجتے ہیں:

مے پرستید اخترے کو زر کند   رُو باو آرید کو اختر کند

آفتاب از امرِ حق طبّاخ ماست   ابلہی باشد کہ گوئیم او خدا است

اکثر چوریاں اور حادثے تورات میں پیش آتے ہیں جب سورج کہیں ڈوب چکتا ہے۔ اس وقت یہ خورشید پرست اپنے معبود کو مدد کے لئے پکارنا چاہیں تو وہ حضرت اس وقت موجود ہی نہیں جو ان کی دادرسی کریں۔ ایسے سورج کو کیوں نہیں پوجتے جو کبھی غروب نہیں ہوتا جس کے اندر روز و شب کا فرق نہیں ایسا سورج انسان کی روح پاک میں طلوع ہوتا ہے۔ وہ شرقی اور غربی نہیں:

جز روانِ پاک او را شرق نے   در طلوعش روز و شب را فرق نے

اس خورشید جاں کے مقابلے میں خورشید جہاں کی اتنی حقیقت بھی نہیں جو سورج کے سامنے ایک ذرۂ ناچیز کی ہے۔

قرآنِ کریم میں کائنات کی ابتدائی حالت کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ ایک دھواں یا کہر یا بخار کی صورت تھی۔ طبعیاتِ تکوین ترقی کر کے زمانۂ حال میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہے۔ خدا نے جو کچھ چودہ سو برس پہلے کہہ دیا سائنس اب اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ اس کو انگریزی میں نیبولر مفروضہ کہتے ہیں۔ ثم استویٰ الی السماء وھی دخانٌ، محی الدین ابنِ عربی نے بھی اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے کہ اجرام فلکیہ اسی دخان میں سے بنے ہیں۔ عارف رومی بھی اس آیت کے یہی معنی سمجھتے ہیں:

کیمیائے کہ از و یک ماثرے   بر دخاں افتاد و گشت او اخترے

نادر اکسیرے کہ از وے نیم تاب   بر ظلامے زد بکرو ش آفتاب

قرآن کریم نے ایک اور روایت میں بھی اس تعلیم کو دُہرایا ہے کہ سمٰوات و ارض پہلے ایک ہی ملی جلی چیز تھے پھر خدا نے ان کو الگ الگ کیا۔

ان السموات والارض کانتا رتقاً۔

ستاروں کو دیوتا سمجھنے والوں کو قرآن بتا رہا ہے کہ نالائقو! یہ تو سب ایک آتشیں بخار یا دھوئیں کی پیداوار ہیں۔ اس خدا کو پوجو جس نے اس بخار میں سے ایسے عظیم الشان لاتعداد شموس و نجوم بنائے۔

شاہانِ خدا فراموش

فرعون صفت خدا فراموش بادشاہوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم سمجھتے ہو کہ تم تخت شاہی پر متمکن ہو لیکن یہ تخت نہیں تختہ ہے اور تمہیں مجرموں کی طرح تختہ بند کیا گیا ہے۔ کم بختو تمہیں اپنے عجز کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔ اپنی داڑھی پر تو حکم نہیں چل سکتا کہ بڑھاپے میں اس کو سفید ہوتے سے روک سکو:

تختہ بند است آنکہ تختش خواندۂ — صدر پنداری و بر در ماندۂ

بادشاہی نیستت بر ریشِ خود — بادشاہی چوں کنی بر نیک و بد

بے مرادِ تو شود ریشت سفید — شرم دار از ریشِ خود اے کژ امید

بادشاہانِ جہاں از بدرگی
بو نبردند از شراب بندگی

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نظامِ حکومت اور تقدیرِ عوام کی باگیں خدا نے ایسے مغرور و برخود غلط لوگوں کے ہاتھوں میں دے رکھی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس میں کچھ حکمت الٰہی ہوگی کہ جب تک کسی بہتر نظام کے قیام کا وقت نہ آئے تب تک انہی فاسقوں کے ذریعے سے سیاست و معاشرت قائم رہے:

لیک حق بہرِ ثباتِ ایں جہاں — مہرِ شاں بنہاد بر چشم و زباں

لیکن اگر یہ لوگ خزانۂ زر جمع کرنے کی بجائے سُرمۂ چشم بصیرت حاصل کرتے تو ان کے لئے باعثِ فلاح ہوتا:

از خراج ار جمع آری از چو ریگ
آخر آں از تو بماند مردہ ریگ
ہمرۂ جانت نگردد ملک و زر
زر بدہ سرمہ ستاں بہرِ نظر

سماع و بصیرتِ حیات

عارف رومی ان بزرگانِ دین میں سے ہیں جن کے نزدیک موسیقی غذائے روح اور معاونِ عبادت ہے۔ چنانچہ مثنوی کے شروع میں بانسری ہی بجائی ہے۔ نے کی لے سے روح کو اپنا اصلی مسکنِ الٰہی یاد آجاتا ہے اور چھوٹے ہوئے وطن کی یاد دردانگیز ہوتی ہے۔ اب مثنوی کے چوتھے دفتر میں پھر ذوقِ سماع کی طرف عود کرتے ہیں اور فیثا غورسی حکماء کا بھی ایک خیال پیش کرتے ہیں کہ ستاروں کی گردش سے نغمے نکلتے ہیں۔ انسان جب اس عالمِ ارضی میں موسیقی سے متاثر ہوتے ہیں تو اس کی یہ وجہ ہوتی ہے کہ افلاک کے نغمے یہاں کے سازوں کے ہم نوا ہوتے ہیں :

پس حکیماں گفتہ اند ایں لحن ہا از دوارِ چرخ بگرفتیم ما
بانگِ گردش ہائے چرخ است ایں عجب می سرایندش بہ طنبور و بہ حلق

اسی خیال کو مرزا غالب نے اس شعر میں باندھا ہے :

زندگانی میری سازِ طالعِ ناساز ہے نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

یہ تو حکماء کا خیال ہے لیکن مومنوں کی توجیہ لذتِ سماع کے متعلق یہ ہے کہ ہم بھی اجزائے آدم ہیں اور آدم جنت میں رہ چکے ہیں جہاں کی فضا دلنواز نغموں سے لبریز تھی۔ یہاں جب ساز بجتے ہیں تو جنت کی زندگی یاد آجاتی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎ مہجورِ جناں حورے نالد بہ رباب اندر

مومناں گویند کاثارِ بہشت نغز گردانید ہر آوازِ زشت
ما ہمہ اجزائے آدم بودہ ایم در بہشت آں لحن ہا بشنودہ ایم

اگرچہ یہاں آب و گل نے ہماری روح پر فراموشی کا ایک پردہ ڈال رکھا ہے لیکن پرانی یاد اس میں سے بھی چھن چھن کر نکلتی ہے :

گرچہ با ما ریخت آب و گل شکے یادِ ما آید ز آنہا اندکے

ہماری روحانیت کا پانی یہاں کی نجاست سے مکدر و ناپاک ہوگیا ہے لیکن ناپاکی کے اندر بھی پانی اپنی تمام صفات تو کھو نہیں بیٹھا۔ نجس پانی بھی آگ بجھانے کے کام تو آسکتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں بھی نغمہ دل کی لگی کو بجھاتا ہے :

گر نجس شد آب ایں طبعش بماند کاتشِ غم را بطبع خود نشاند
پس غذائے عاشقاں آمد سماع کہ دروباشد خیالِ اجتماع

موسیقی کی ایک خصوصیت مولانا یہ بتاتے ہیں کہ دل میں جو جذبات یا خیالات ہوں وہ اس سے قوت حاصل کرتے ہیں صرف اتنا ہی نہیں اس سے بڑھ کر یہ بھی ہوتا ہے کہ نغمہ و الحان سے جذبات اور خیالات صورت پذیر بھی ہوتے ہیں۔ (زمانہ حال میں مغرب میں بعض فن کاروں نے اس کی بھی مشق کی ہے کہ کونسا نغمہ صورت گری میں کس قسم کے نقوش و تصاویر پیدا کرتا ہے)۔

قوتے گیرد خیالاتِ ضمیر بلکہ صورت گردد از بانگِ صفیر

خدا پرست لوگوں کو پانی کی چرخی کی آواز پر بھی وجد آنے لگتا ہے:

کسانیکہ یزداں پرستی کنند برآوازِ دولاب مستی کنند

مولانا نے اس کے متعلق ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص کسی گہرے گڑھے یا کوئیں کے کنارے بیٹھا تھا ڈول رسّی اس کے پاس نہ تھی کہ پانی نکال کر اپنی پیاس بجھا سکے۔ کنارے پر اخروٹ کا درخت تھا اس نے کہا کہ اچھا پانی نہ سہی پانی کی آواز ہی سہی اس نے اخروٹ توڑ توڑ کر کوئیں میں گرانے شروع کئے، جب اخروٹ پانی میں گرتا تھا تو اس سے پانی کی آواز نکلتی تھی۔ پیاسے کو پانی کی آواز بھی خوش آیند معلوم ہوتی ہے، وہ مسلسل اخروٹ توڑ توڑ کر پھینکتا گیا۔ کسی دیکھنے والے نے کہا کہ یہ کیا حماقت ہے کہ اچھے کھانے کی چیز کو اس طرح ڈبو رہے ہو۔ اس نے کہا کہ مجھے بھوک نہیں بلکہ پیاس ہے اور یہ آواز پیاس کے لئے باعثِ تسکین ہے۔ روحانی سماع والوں کا بھی یہی حال ہے اچھی آوازیں ان کے لئے روح پرور ہوتی ہیں۔ اس اخروٹ گرانے سے ہمیں حکیم المانوی گوئٹے کے بچپن کا ایک قصہ یاد آگیا اس نے خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ ماں باپ کی نظر سے اوجھل میں نے چینی کا ایک پیالہ کھڑکی سے سڑک کی طرف پھینک دیا اس کے ٹوٹنے سے بڑے لطف کی آواز پیدا ہوئی۔ میں چینی کے تمام برتن ایک ایک کر کے کھڑکی کے باہر پھینکتا گیا۔ اس وقت تو مزا آگیا اور بعد میں پٹ جانے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اخروٹ پھینکنے والا کہتا ہے:

قصدِ من آن است کاید بانگِ آب ہم بہ بینم بر سرِ آب ایں حباب

موسیقی اکثر مذاہب عالیہ کی عبادت میں داخل ہے۔ مسلمانوں میں اس کے متعلق اکابر کی آرا ہمیشہ سے مختلف بلکہ متضاد رہی ہیں۔ لبِ لباب یہ ہے کہ جس موسیقی سے ادنیٰ شہوات کو انگیخت ہو وہ یقیناً از روئے دین حرام ہونی چاہئے لیکن جو سماع روحانی میلانات کو ترقی دے وہ جائز بلکہ احسن ہے۔ صوفیہ چشتیہ کی طرح امام غزالی کی اس بارے میں یہی رائے ہے۔